© rasailojaraid.com

مغرب کو اسلامی بنیاد پرستی کا خطرہ (۳۹)

کلیرنس جے بوشات

بیسویں صدی کے اختتام پر نئے عالمی نظاموں کے مبلغ یقیناً بہت مایوس ہیں کہ سرد جنگ کے بعد "آرڈر" نام کی شے کہیں نظر نہیں آتی۔ کسی زیادہ انسان پرور نظام کے متعلق جیسے جیسے مایوسی بڑھتی جا رہی ہے، موجودہ علاقائی مناقشے پرانی شکلیں اختیار کر رہے ہیں۔ کبھی مغرب و مشرق کی رقابت تھی، تو اب شمال اور جنوب کی تقسیم ہے۔ ایک وقت سرخ کمیونزم کا زور تھا یا اسود انارکسٹ لہریں طوفان اٹھا رہی تھیں، اب سبز اسلام کے منڈلاتے خطرے نے دھڑکنیں الٹ پلٹ کی ہوئی ہیں۔

سیاسی اسلام اس لئے بھی بڑی مصیبت لگتا ہے کہ اس کا ظہور ایک ایسے خطے میں ہو رہا ہے، جو مغرب کے لیے معاشی اور جغرافیائی طور پر بے حد اہم ہے۔ مراکش سے منڈا ناؤ تک سیاسی بے چینی کی بنیادی وجوہات معاشی بھی ہیں۔ آبادی سے متعلق بھی، طبعی اور ماحولیاتی بھی۔ لیکن عدم استحکام کی تشریح اور بیان صرف ایک بڑے مسئلہ یعنی اسلام کے حوالے سے ہی ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

مغربی مفادات کے لیے اسلامی بلاک کا قیام، مسلم مملکتوں کا عدم استحکام اور جنگجو بنیاد پرستی یہ سب وہ امکانی خطرات ہیں، جو حالات کو جوں کا توں رہنے نہیں دیں گے۔ لیکن نئی طاقت سے سرشار اسلام یقیناً یہ موقع بھی فراہم کرتا ہے کہ مغرب ایک اہم علاقے سے اپنے تعلقات درست کر لے۔

ایک اسلامی اساس

اسلام اور عیسائیت میں دونوں کے متبعین کے تاریخی ٹکراو کے باوجود بہت کچھ یکساں ہے۔ یہ یکسانیت جہاں ایک دوسرے کو بہتر سمجھنے میں مدد دیتی ہے، وہیں گہرے شکوک کو بھی جنم دے سکتی ہے۔ اسلام کا بنیادی عقیدہ یعنی "خدا کی بندگی اور اس کی رضا کے سامنے کلی خود سپردگی" وہ بڑی وجہ ہے، جس نے ایسے تصورات کو جنم دیا کہ اسلام مغرب کے لیے خطرہ ہے۔ یہ کلی اطاعت جو عیسائیت میں اس درجہ پر کبھی نہیں پہنچ پائی، نہ صرف انفرادی اور اخلاقی انضباط چاہتی ہے، بلکہ وسیع تر معاشی، سماجی، قانونی اور سیاسی قواعد پر بھی حاوی ہے۔ نیز معاملہ صرف سفارش کی حد تک نہیں، بلکہ ان قواعد کی پابندی لازمی ہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں۔ "قرآن میں جو کچھ مرقوم ہے، برحق ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ زندگی میں ان احکامات کی تعمیل کرے اور جو کچھ اس کے خلاف ہے، اسے چھوڑ دے"۔ لیکن صورت یہ ہے کہ بقول شہزادہ محمد بن فیصل "سعودی عرب، جہاں مغربیوں کے لیے ناقابل قیاس حد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک اسلام زندگی کے معاملات میں دخیل ہے' وہاں بھی دین پر پورا عمل نہیں ہو رہا"۔ فرد اور سماج کے فرائض میں جو تضاد مسلم ممالک کے زمینی حقائق کی روشنی میں سامنے آتا ہے' وہ بے اطمینانی کی ایک چنگاری اور مغرب اور علاقے کے استحکام کے لیے خطرہ ہے۔

دین و دنیا کی تفریق ایک قطعی مغربی تصور ہے۔ مسلمان اسے ناقابل عمل جان کر مسترد کرتے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک محترم دینی' سیاسی اور فوجی رہنما تھے۔ نبی کی یہی عملی مثال مسلمانوں کے لیے شافی دلیل ہے کہ دین اور سیاست کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مغرب کا تاریخی تجربہ اسے انتہا پسندی قرار دیتا ہے' لیکن اسلامی دنیا ایسا نہیں سمجھتی۔ مزید یہ کہ اسلام کا دینی اور سیاسی نظام تمام مسلمانوں کو یکساں سمجھتا ہے اور متحد دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی مثال خلفائے راشدین کا دور ہے۔ خلافت جب تک رہی' خواہ بعد میں برائے نام ہی سہی' وہ اسی وحدت ملت اسلامیہ کے تصور پر قائم رہی۔ آج کا نامکمل اور بے جوڑ سنجوگ' جو اسلامی تصورات اور مسلمان ممالک کی لادین حکومتوں کے درمیان موجود ہے' اس اسلامی احیا کو جنم دے سکتا ہے' جو سماجی اور سیاسی ہیجان برپا کر کے مغرب کو خطرے سے دوچار کر دے۔

اسلام کی ایک اور خصوصیت بھی اقوام مغرب کے عدم تحفظ کے احساس کو بڑھاتی ہے۔ ہر الہامی تعلیم کی طرح اسلام' جو عالم گیر اور آفاقی ہے' اختلاف تعبیر کے مواقع دیتا ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کو جمہوریت کے تصورات بھی مل جاتے ہیں' فرد کے اقتدار کلی کے بھی اور بین الاقوامی جہاد کے بھی۔ جہاں قرآن غیر مبہم بات کرتا ہے' وہاں بھی کافی تفسیری وسعت کی گنجائش ہوتی ہے۔ چنانچہ انتہا پسندی پر مائل بعض فتاویٰ انفرادی قتل' خود کشی دھماکوں اور جنگ تک کا جواز مہیا کرتے ہیں۔ مغرب کو ایک ایسے دین سے واسطہ ہے' جو اپنے ماننے والوں کو پرامن رہنے کی تلقین کرتا ہے' لیکن جس کے فتوے مغرب کے امن کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ لوگ مقابلے میں ان قابل احترام فتاویٰ کو بھول جاتے ہیں' جو ایسی انتہا پسندی کی اجازت نہیں دیتے۔

یہ فتاویٰ جو اکثر دسویں صدی عیسوی کے اقوال پر مبنی یا ان سے ماخوذ ہیں' اپج کیا تخلیق کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ خواتین کے حقوق یا اقلیتوں سے متعلق جیسے مسائل پر جامد رویہ۔ مغرب کے خیال میں اس کے طور طریقوں سے ٹکراو کا باعث ہے اور اس ضمن میں بعض مسلمانوں کی معذرت خواہی بے اثر رہتی ہے۔

نیا جہاد

مغربی کیمپ بھول نہیں پا رہا کہ ڈیڑھ ہزار سال سے دو تہذیبوں اور سلطنتوں میں مسلسل ٹکر رہی ہے۔ آگے اسے مزید تناؤ کے امکانات نظر آتے ہیں۔ اسلامی محاذ کی طرف سے بھی ایسی حرکتیں ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہی ہیں کہ جھگڑا سرد نہیں ہو پا رہا۔ کیا مغرب اسے واقعی دو تہذیبوں کی جنگ سمجھتا ہے یا کمیونسٹ اور فاشسٹ خطرات ٹل جانے پر اسلامی ہوا از خود کھڑا کر رہا ہے؟ حقیقی خطرہ دراصل وہ ہوتا ہے' جہاں نقصان پہنچانے کے ارادے ہوں' وسائل ہوں اور تنظیم موجود ہو۔ لیکن ان چیزوں کا اسلامی دنیا میں دور دور نشان بھی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سپین' پرتگال اور اٹلی کے محاذ پر عربوں کے خلاف' بلقان میں ترکوں کے خلاف اور روس اور قفقاز میں نو مسلم مغلوں کے خلاف مغرب ہزار برس تک دفاع پر رہا۔ البرٹ ہورانی کے خیال میں یہ تلخ یادیں مغربی شعور میں اب بھی پیوست ہیں۔ نیٹو کے ایک سیکرٹری جنرل ولی کلائیس "اسلامی مہم جوئی کو مغرب کے دفاع کے لیے سنگین خطرہ" بتاتے تھے۔ یونانی وزیر دفاع آئیو انیس باربت سیوٹیس (Ioannis varvitsiotes) اسلام کے متعلق کہتا ہے: "علاقے میں عدم استحکام کا عامل' امن اور دفاع کے لیے بڑھتا ہوا خطرہ"۔ ایران میں امریکی یرغمالیوں کا خرخشہ اٹھا' تو امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ سائرس وانس نے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر امریکہ نے حرکت کی' تو "مغرب اور اسلام کی جنگ" چھڑ جائے گی۔ ماضی کی تلخ یادوں کے یہ اثرات اپنی جگہ' لیکن کیا اس درجہ خوف کا کوئی جواز موجود ہے؟

اسلام کو ایک متحدہ دینی سیاسی قوت اور جامع خطرہ بننے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ ایک ارب مسلمانوں کے مسلم اکثریت رکھنے والے ۴۵ ممالک اپنے سارے اختلافات بھلا کر ایک مقصد مثلاً" مغرب سے ٹکرانے کے لیے یکجا ہو جائیں۔ ایسا اتحاد ایک دینی اسلامی فرض ہی سہی' لیکن اس کا دور پار بھی کوئی امکان موجود ہے؟ اس صدی کے دوران مصر کے شاہ فاروق' اردن کے حسین' سعودی عرب کے فیصل اور فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی نے اپنی سی کر لی' لیکن کیا وہ مسلمانوں کو متحد کر سکے؟ برنارڈ لیوس کا خیال ہے کہ یہ سب تھڑدلانہ کوششیں تھیں' اس لیے ناکام ہوئیں۔ اگر مناسب لیڈر شپ میسر آ جائے' تو بین الاسلامی اتحاد کے لیے مسلم معاشرے کا جواب مثبت ہو گا۔

مثلاً" اخوان المسلمین کی ماڈرن تحریک' جو عرب دنیا میں دور تک پھیلی ہوئی ہے' متحدہ اسلامی خلافت کی داعی ہے۔ آج کے مسلمانوں کے باہمی اختلافات سنگین سہی' پر اتنے بھی نہیں' جیسے ساتویں صدی کے عرب بدوؤں کے تھے۔ وہ قرنوں کی خونی رنجشیں بھلا کر اکٹھے ہوئے اور ہندوستان سے فرانس تک پھیلی ہوئی سلطنت قائم کر بیٹھے۔ قریبی دور میں ملک عبدالعزیز نے اسلام کے ذریعے جنگجو جتھوں کو متحد کر کے سعودی مملکت قائم کر دی۔ اسلام میں سیاسی اتحاد کے بغیر بھی احکامات دین پر عمل کی یکسانیت عالمگیر ہے۔ مارچ ۱۹۸۲ء میں انتہا پسند علماء کی مجلس نے تہران میں بیشتر شیعی اور کچھ سنی علماء کو اکٹھا کیا۔ تاکہ کامل اسلام کی پاکیزہ ترین شکل میں احیا کی تحریک چلائی جا سکے اور بالاخر مغرب پر یلغار کی راہ ہموار کی جا سکے۔ ابھی تک یہ عملی "خومنترن" (Khomeintern) (بروزن کومنترن) یا "اسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انٹرنیشنل" وجود پذیر نہیں ہوا۔ لیکن ہم خیال مہم جوؤں کے اقدامات اور اعلانات مغرب کو خوف زدہ ضرور رکھتے ہیں کہ کسی دن اسے اسلامی چہار درویشوں کا سامنا کرنا ہو گا۔

مسلمان متحد بھی ہو جائیں، تو ان کے پاس وہ کم سے کم وسائل کہاں ہیں، جو مغرب پر تاخت جیسی مہم جوئی کے لیے ضروری ہیں؟ کمیونزم نے پرولتاری انقلاب کے لیے جو وسائل جھونکے، اسلامی جہاد کے لیے اس کا عشر عشیر بھی میسر نہیں۔ اس سے بڑھ کر حقیقت یہ ہے کہ جہاد کو بالکل غلط طور پر مہم جوئی کا ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ مودودی صحیح طور پر جہاد کو "اللہ کی راہ میں جان کھپانا" کہتے ہیں۔ بعض مسلمان حیران ہیں کہ جہاد کو "خطرہ" کیسے سمجھ لیا گیا۔ عبد مرزوق لکھتے ہیں: "جہاد ہمیشہ مدافعتی عمل رہا ہے"۔ لیکن اس کے جواب میں جنگجو مسلم گروہ ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ جہاد کو "اسلام کا چھٹا بنیادی رکن" ہونا چاہیے۔ ان کے خیال میں جہاد کا نرم تصور کسی سرنگوں مولوی کی اختراع ہے، جو اس نے اپنے ملک کے بداخلاق حکمرانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کی۔ یہ دوہری تشریح بجائے خود ایک "سازشی تھیوری" بن جاتی ہے اور مغرب کی الجھن ختم نہیں ہو پاتی۔

مغرب کی مختلف روایت وہاں کے شہریوں کو اس بات پر حیران کرتی ہے کہ دین سیاست میں کوئی اہم کردار کیسے ادا کر سکتا ہے۔ ان "غیر مومنین" کے لیے ۱۹۷۳ء کی عرب، اسرئیل جنگ نمونہ ہے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ عرب قوم پرستی اور لادینی کے جھنڈوں تلے لڑی گئی۔ اس خوفناک ہزیمت نے اسلامی احیا کا راستہ صاف کیا۔ ۱۹۷۳ء کی جنگ کا کوڈ نام "بدر" تھا۔ "رمضان" میں لڑی گئی اور اسی نام سے یاد کی جاتی ہے۔ نتیجہ نے بہتوں کو مطمئن کر دیا۔ ابوالاعلیٰ مودودی نے "الجہاد فی الاسلام" میں کھل کر لکھا کہ جہاد کا حتمی مقصد کفر کا استیصال اور اسلامی نظام کا قیام ہے۔ معذرت خواہوں نے اس قول کی تشریح کی ہے کہ یہ بیرونی نہیں "اندرونی تبدیلی" کی بات ہے۔ لیکن یہ بہرکیف عذر لنگ ہے۔ ایسی تحریر مغرب کو موقع دیتی ہے کہ وہ بنیاد پرستوں کے عزائم کو من مانا رنگ دے۔

بہرکیف امر واقعی یہی ہے کہ اقوال و اعلانات اپنی جگہ، لیکن مسلمانوں کے پاس وہ قوت موجود نہیں، جو ان کے عزائم کو پورا کرنے میں مدد دے سکے۔ مسلم شمالی افریقہ ہو یا جنوب مغربی ایشیا، حد سے حد اپنا دفاع کر سکتا ہے اور روایتی انداز میں مغرب کے لیے کوئی خوفناک صورت پیدا کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ البتہ جو لوگ اسلامی توسیع پسندی سے ڈر رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نیوکلیائی، حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں کی شکل میں برابر کی چوٹ موجود ہے، خواہ اس کے لیے بیلاسٹک میزائل استعمال ہوں یا کوئی تخریبی انداز اپنایا جائے۔ وہ کہتے ہیں، پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں، جنہیں ذوالفقار علی بھٹو نے "اسلامی بم" کہا تھا۔ اپنی دگرگوں معیشت کے باوجود ایران بھی ایٹمی راہ پر گامزن ہے۔ ان اقدامات کا یہ نتیجہ لازمی نہیں کہ براہ راست ایٹمی ٹکراؤ ہو، لیکن جنوبی یورپ (بلقان) اور شمالی افریقہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی طرح کی نیابتی مداخلتوں کا راستہ کھلا رہے گا۔

کوئی سرد جنگ قسم کی چیز تو ممکن ہے، لیکن متحدہ مسلم فوجی اقدام کے ذریعہ گرم جنگ بھڑکانا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ سرد جنگ بھی اس لیے کہ اس سے اصلاً" اندرونی فوائد کا حصول یعنی اپنی مدت اقتدار بڑھانے کا موقع ملتا ہے۔ اسی پس منظر میں ترکی اور پاکستان کی حکومتیں مدد مانگتی رہتی ہیں کہ وہ ایرانی انتہا پسندوں کے خلاف فصیل کا کام دے رہی ہیں۔ سرب قوم پرست اپنے آپ کو یورپ میں اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف مہم کا سرپرست بنا کر پیش کرتے رہے۔ اسرائیل نے اب فلسطینی قوم پرستی کا ناطہ کمیونزم سے توڑ کر اسلامی بنیاد پرستی سے جوڑ دیا ہے۔ کوئی کچھ کہے، مسلمان فرقوں میں بٹے ہوئے اور سماجی، معاشی اور سیاسی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہیں۔ ایک نسل اور زبان کے باوجود جمال عبدالناصر عربوں کو یکجا نہ کر سکا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اکٹھا کرنا کتنا مشکل ہو گا۔ اس استدلال کا یہ مطلب لینا بھی صحیح نہیں کہ مغرب کے لیے اسلامی احیا کا کوئی خطرہ موجود نہیں۔ لیکن ارادوں کی کوئی مربوط عملی تشکیل اگر ہے بھی، تو بہت دور مستقبل میں ہے، فوری خطرہ کہیں نہیں۔

مسلم مملکتوں کا عدم استحکام

محدود وسائل کی اس دنیا میں مغرب کے لیے ممکن نہیں کہ اصل مسائل چھوڑ کر موہوم خطرات کے خلاف وقت اور پیسہ کھپائے۔ یورپ کو "بحیرہ روم کی تعاون اور دفاع کی کانفرنس" جیسی اطالوی تجویزوں کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ یہ نام ہی ایسا ہے کہ "یورپ ۔ اسلام" ٹکراؤ کے تصور کی نفی کر دیتا ہے۔ اصل خطرہ اگر ہے، تو اس سیاسی عدم استحکام سے ہے، جس نے مسلم ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس عدم اطمینان میں اسلام ایک بڑا عامل ہے اور اوپر سے وہ تیل، جو اس جلتی پر مغرب خود چھڑک رہا ہے۔ شمالی افریقہ اور جنوب مغربی ایشیا کے حالات سرد اور ٹھٹھرے ہوئے ہیں۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ معیشتیں تنگ ہیں۔ شہری ماحول آلودہ ہے اور سیاست امید افزا نہیں۔ عرب قوم پرستی کا گھوڑا مردہ ہے۔ قوم پرستی اور اختیار کلی اجنبی تصورات ہیں اور اسلام کے سامنے سرنگوں ہو رہے ہیں۔ سرمایہ داری کئی حوالوں سے اسلام کے موافق ہونے کے باوجود غریبوں میں راہ نہیں بنا پا رہی کہ اس کے فوائد بیشتر امیروں کے لیے ہیں۔ دو دہائیوں کے غیر اسلامی تجربات نے سماجی اور سیاسی عدم اطمینان کو بڑھایا ہے۔ مسلم روایت سے مختلف کوئی بھی مغربی ماڈل تنفر کا باعث بنتا ہے۔ اس دراڑ میں ایک حوصلہ مند اسلام اپنی راہ بنا رہا ہے۔ ایک ایسے عمل کے طور پر، جسے مختلف مسلم معاشرے اپنی ضرورت اور ماحول کے مطابق ڈھال سکیں۔ سماج اور مملکت کے ایک جامع فلسفہ اور نظریہ کے طور پر اسلام مسلمانوں کو بنیادی اقدار اور روایات کی طرف پلٹنے اور مزمن سماجی اور اقتصادی مسائل سے عہدہ برا ہونے کا موقع دے رہا ہے۔ ہر مسلم اکثریت اپنے انداز میں قدم بہ قدم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ لیبیا، سعودی عرب، پاکستان، سوڈان اور ایران کی مختلف شکلیں اور طریقے دیکھیے، لیکن ہر ملک دلیل کے ساتھ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ قرآنی تعلیمات کا اتباع کر رہا ہے۔ مغرب کو ٹھہر کر دیکھ لینا چاہیے کہ آیا اسلام واقعی مختلف النوع ترقیاتی مسائل کو حل کرتا ہے یا ان امراض سے بھی بدتر کوئی صورت سامنے لاتا ہے۔ البتہ مغرب اصلاحی امور میں تعاون کی راہ اپنائے اور اس دوران اپنے جائز مفادات کا تحفظ بھی ضرور کرے۔

مغرب کا ایک گلہ یہ ہے کہ اسلام میں رواداری اور جمہوریت کے مغربی تصورات کو سمونے کا اہتمام موجود نہیں۔ قرآن میں اجماع اور شوریٰ کے متعلق اہم بنیادی تعلیمات ہیں، اگرچہ مسلمان انہیں مغربی تصورات کا بالکل ہم معنی نہیں سمجھتے۔ عملاً" صرف ترکی اور ملائشیا میں کسی حد تک مستحکم جمہوریت ہے۔ باقی ہر جگہ یا تو ایک پارٹی ہے یا فوجی پشت پناہی میں کوئی نام نہاد عوامی ڈھانچہ۔ مغربی قوتوں کی شکایت اپنی جگہ، لیکن بنیاد پرستی کے خوف سے وہ مسلمان ممالک میں کلیت پسند بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں کی حمایت میں سرگرم رہتی ہیں اور حالات کو جوں کا توں رکھنے کے لیے ناپسندیدہ حکمرانوں کی حمایت کرتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ منفی ہی نکل سکتا ہے اور اسلام ایک مقابل قوت بن کر ہی کھڑا ہو سکتا ہے۔ مغربی رویہ منافقت پر مبنی ہے کہ قول و فعل میں تضاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مغرب مخالف اسلامی حکومت شاید اتنی خطرناک نہ ہو، جتنی ایک مغرب پرست غیر مقبول اور بدعنوان حکومت ہو سکتی ہے۔ ایسی حکومتیں وہ صورت حال پیدا کر سکتی ہیں کہ سب کچھ بھک سے اڑ جائے۔

مغرب والوں کا ایک خدشہ یہ ہے کہ عوامی ووٹوں سے منتخب ہو کر آنے والی حکومت بھی "ایک فرد، ایک ووٹ، ایک وقت کے لیے" کا نقشہ پیش کر سکتی ہے۔ جس نظام کو الٰہی احکامات کے تحت چلایا جائے، اس میں اختلاف کا کیا امکان ہے؟ غیر مسلم کتنے بھی ناخوش ہوں، انہیں اسلامی حکومت میں سر ڈال کر رہنا پڑے گا۔ اہل کتاب کو بعض معاملات میں مسلمانوں جیسے تحفظات حاصل ہیں، لیکن بعض میں نہیں۔ غیر اہل کتاب کا حال تو وہ ہو گا، جو ایران میں بہائیوں، پاکستان میں احمدیوں یا سوڈان میں مظاہر پرستوں کا ہوا۔ ملک کے اندر ایسے اقدامات، بیرونی معاملات میں ٹانگ اڑانا یا بیرونی ہوا کھڑا کرنا، دراصل سنگین اندرونی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے ہوتا ہے۔ ایران، سوڈان یا لیبیا یہی کھیل کامیابی سے کھیل رہے ہیں۔ لیبیا نے مورو فرنٹ یا آئرش آرمی کی مدد اسی لیے کی۔ سعودی عرب حماس اور دیگر انتہا پسند گروپوں کی حمایت کرتا رہا، تاکہ "مسلم فکر" مطمئن رہے۔ کوئی عوامی ہیجان یا خانہ جنگی کی صورت ان غیر مستحکم ملکوں میں وہ سیاسی دلدل پیدا کر سکتی ہے، جس میں امریکہ اور یورپ دھنس کر رہ جائیں۔ چارلس کراتھیمر اس صورت حال کو "عالمگیر انتفاضہ" کا نام دیتا ہے، جو گردوپیش سب کو لپیٹ لے گی۔ سوڈان کے حسن الترابی کہتے ہیں: "قریب کے دور میں کسی اسلامی حکومت کی کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مثال سامنے موجود نہیں"۔

اس لیے بعض اوقات خود مسلمانوں کو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کے بارے میں وہ کیا کریں۔ یہی خدشات اس امر کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ یورپی ممالک نے اپنے آپ کو شمالی افریقہ (الجزائر)، بلقان اور وسطی ایشیا میں اتنا ملوث کیوں کر دیا۔ یہ سب دراصل سیاسی، سماجی اور اقتصادی جنگ اور ایسی ہی دوسری مصیبتوں کو ٹالنے کی کوشش تھی۔

انتہا پسندی ہر جگہ ہے اور اسلامی دنیا میں بھی ہے۔ لبنان میں امریکی میرین اور فرانسیسی بیرک تباہ کرنے والوں کا دعوی تھا کہ وہ نہ ایرانی ہیں نہ شامی اور نہ فلسطینی، بلکہ صرف مسلمان ہیں اور قرآن کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔ لیکن یہ انتہا پسندی اسلامی تاریخ کے لیے نئی نہیں۔ ۱۰۹۰ء میں اسماعیلی فدائین سامنے آئے۔ وہ جہاں عیسائی صلیبیوں پر حملے کرتے تھے، وہیں سنی مسلمان بھی ان کا نشانہ بنے۔ تب بھی آج کی طرح دلائل قرآن ہی سے سامنے لائے جاتے تھے۔ مغربی ممالک کو یہ عقائد اور تشریحات خوف زدہ رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاں رہائش پذیر مسلم غیر ملکیوں کے متعلق بھی خدشات کا شکار رہتے ہیں۔

۳- تجدیدی پیش رفت

اسلام اور مغرب نے اگر ایک ایک بار فریق مخالف کو فتح اور اس کے عقائد تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے، تو دونوں ہی نے ایک دوسرے کی اٹھان اور ترقی میں مدد بھی دی۔ آج ہر دو سماج کے پاس جو جو کچھ ہے، وہ اس باہمی مدد اور تعاون کے بغیر ممکن نہ تھا۔ یہی بات مستقبل کے لیے امید افزا ہے۔ اسلامی دنیا اس وقت احیا کے ایک گہرے عمل سے گزر رہی ہے۔ اس میں مغرب کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ خواہ سوچا سمجھا ہو یا ان جانا بوجھا۔ اپنی اس نئی احیائی شکل میں اسلام شوخ اور نڈر بھی ہے، حوصلہ مند اور بے لچک بھی۔ اور بالیقین "نظام نو" سے کسی مصالحت کا روادار نہیں۔ مغربی تجزیہ نگار یہ جاننے سمجھنے کی کوشش کریں اور بہتر ہے تسلیم کریں کہ اسلام کا مسلم دنیا کی اقتصادیات، ثقافتوں، نفری معلومات سیاسیات اور جغرافیہ کی تشکیل و ترتیب میں ایک کردار ہے۔ ٹکراؤ اور بدگمانی کے جن حالات سے ہمیں واسطہ ہے، اس حوالے سے دو کام کرنے کے ہیں۔ اولاً" یہ کہ دونوں قوتوں کو جو گتھم گتھا ہونے کو ہیں یا کہیں کہیں ہو چکی ہیں، جدا کر دیا جائے۔ ثانیاً" ان عوامل کی آہستہ آہستہ ترویج ہو، جو باہمی تعلقات کو معتدل اور قابل برداشت بنا دیں۔

جدائی کا مطلب تعلقات کا یکسر انقطاع نہیں، جس کی دونوں طرف کے شدت پسند خواہش رکھتے ہیں۔ اگر اسلام نڈر ہے، با اعتماد ہے اور عقائد میں بے لچک ہے، تو یہی حال امریکہ کا بھی ہے۔ مفادات کا ٹکراؤ اور تصادم تعلقات کو بلاوجہ بگاڑنے کا سبب ہیں اور غیر گریز طبقات کا حوصلہ بڑھاتے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ ٹکراؤ تو خود مغرب کے اندر بھی ہے یا مثلاً" مغرب اور جاپان کے مابین بھی ہے۔ لیکن اسے ایک حد میں رکھنے کے اقدامات ہوتے ہیں اور بالاخر اڑچنیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن اسلام اور مغرب کی بداعتمادی کسی نہ کسی بات پر دونوں کو آتش زیر پا رکھتی ہے۔ عراق نے کویت کو روندا' تو خود مسلمانوں اور اسلامی تحریکوں نے اس کی مذمت کی۔ لیکن آپریشن ڈیزرٹ شیلڈ کی آڑ میں جیسے ہی علاقے میں مغربی اثرات کا نفوذ ہوا' تو حکومتوں کا معاملہ جو کچھ بھی ہو' عوامی حمایت کا رخ مڑ گیا۔ مغربی در اندازی برداشت نہیں ہوتی اور اس کے خلاف اقدام ضروری ہوتا ہے' خواہ اجتماعی قوت کے مظاہرے کی شکل میں ہو یا انفرادی تخریب کاری کے رنگ میں۔ مغرب کے لیے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی صورت حال ہے۔ وہ جب کسی مسلم معاشرے میں ایک "جمہوری حکومت" قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے' تو مسلمان اسے ناروا در اندازی اور ثقافتی سامراجیت سمجھتے ہیں۔ بہ خلاف جب مغرب انتہا پسندی کے خوف کاشکار ہو کر مسلمان استبدادی حکومتوں سے تعاون کرتا ہے' تو اس پر منافق اور مسلم آزار ہونے کا ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ مغرب اور امریکہ کو ایک بے انجام صورت حال کا سامنا ہے۔ وہ جتنی زیادہ کوشش کرتے ہیں' مخالفت اتنی ہی بڑھتی اور وصولی اتنی ہی کم ہوتی ہے۔ چھڑانے یا جدائی کی پالیسی مغرب کو موقع دے گی کہ وہ رک کر وچار کر لے اور بے سود اقدامات سے باز آ جائے۔ بھڑکیلی صلیبیت' مغربی اقدار اور معیارات' مہنگی امداد اور دفاعی تعاون' ان سب اطوار کا حاصل کم اور دکھ زیادہ ہیں۔ مغرب ذرا "نگاہ لطف" پھیر لے' تو مسلمان حکمران سنجیدگی سے عوامی مسائل پر توجہ دیں۔ یوں مسلمان معاشروں سے وہ "خارجی شیطان" بھی دفع ہو جائے گا' جس کا تصور اور ورد وہاں کی اپوزیشن کا خون گرم رکھتا ہے۔ بعض ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس "بے اعتنائی" کے نتیجے میں اسلامیت کا کوئی سیلاب نہیں آئے گا' بلکہ اسلامی جذبہ دھیما ہو کر ایک زیادہ رواجی شکل اختیار کر لے گا' جو مغرب کے لیے بھی قابل برداشت ہو گا۔

غالب مسلم آبادی والے ممالک میں اپنا سیاسی کردار کم کرنے اور اپنی پالیسیوں کا از سرنو جائزہ لینے کا مطلب یہ نہیں کہ مغرب وہاں خود اسلامی احیا کی قوتوں کا رفیق بن جائے۔ بعض سیاسی طور پر تربیت یافتہ اسلامی گروپ اچھے خاصے شاطر ہو چکے ہیں۔ وہ بیرونی ابلاغی اداروں' سرکاری کارکنوں اور مقامی شہریوں کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے خود مغربی زبان اور اصطلاحات استعمال کرتے اور برسراقتدار جنتا کے اقدامات کا منہ چڑاتے ہیں۔ مغرب کی طرف سے نکھڑنے کی پالیسی یہ سب مصنوعی صورتیں ختم کر کے حقیقی اور زیادہ پائیدار تعلقات کے قیام کا باعث ہو گی۔ ایک زیادہ کھلی ڈھلی یا مفتوحہ پالیسی سے ابتدا میں کچھ نقصان بھی ہوتا ہے۔ لیکن جب گرد بیٹھتی اور تلخ حقائق کا سامنا ہوتا ہے' تو مہم جوئی ترک کرنی اور دست تعاون بڑھانا پڑتا ہے۔ تناؤ کی کیفیت ختم ہو جائے' تو ضرورت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احتیاج عقل کی راہ بجھاتی ہیں۔

چلیے مان لیتے ہیں کہ مسلم مملکتیں اپنے اصل اور بنیادی اسلامی سرچشمے کی طرف پیش قدمی جاری رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے لیے بھی آخر کار ہم آہنگی کے سوا چارہ نہیں۔ مغرب میں تو نت نئی تبدیلیوں کا ایک سلسلہ ہے' جبکہ اسلامی دنیا نے اجتہاد یا اختراع کے دروازے خود پر ایک ہزار سال سے بند کیے ہوئے ہیں۔ اسے مسلم الہامی کتاب کی نئی تشریح قبول نہیں۔ اپنے معاشرے میں تعظم و تحجر اس کی اپنی آوردہ ہے۔ صدیوں سے مسلمان زبوں حال اور درماندہ ہیں' کیونکہ جمود کا رویہ کسی قرآنی حکم پر مبنی نہیں' بلکہ ایک خود ساختہ لیکن عزیز از جان روایت ہے۔ عظیم ترین اکثریت اہل السنتہ کی ہے اور وہ اس "بند دروازوں" کے تصور سے چمٹی ہوئی ہے' جب کہ شیعہ طرز تفسیر اور استنباط میں زیادہ وسعت ہے۔ بے حد سرگرم بنیاد پرست بھی بیشتر اپنے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے جدیدیت کے قائل ہیں۔ قرآن کی کثیر الطباعتی انداز میں وسیع اشاعت اور ریڈیو' ٹیلی ویژن اور لاؤڈ سپیکر وغیرہ کا استعمال جدیدیت ہی کی راہ سے ممکن ہوئے۔ ذرا توجہ فرمائیں' تو اکثر مسلمان تسلیم کر لیں گے کہ وہ جدیدیت کے مخالف نہیں' بلکہ مغربیت سے نالاں ہیں' جو ایک متقابل اور اجنبی ثقافت ہے۔ مسلمانوں کو اپنے معاشرتی استحکام اور ترقی کے لیے الہامی احکامات کے دوائر میں رہتے ہوئے جدیدیت اور ترقی کی راہیں کھولنی ہیں۔ مجھ میں اتنی جرات نہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اس تجویز کا پورا مطلب سمجھا سکوں' لیکن خدا کی بندگی کے تحت اسلام کے تصور امن اور انسانی مساوات کو سامنے رکھیں' تو سماجی فیصلوں میں عوامی شرکت' عدل و انصاف اور عملیت لازمی لگتے ہیں۔ جس ملت کی بنیادوں میں حقیقی ترقی پسند قوت کا عظیم ورثہ ہو' اس کے لیے اپنے دین کی نئے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق نئی تشریح اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسلام ایک تہذیبی قوت کے طور پر اپنے کردار کا تسلسل باقی رکھ سکے۔

(تلخیص' صاحبزادہ محب الحق)

© rasailojaraid.com